''اور اگر میں انکار کر دوں .....تو.....؟''

کچھ دیر جہانگیر سوچتا رہا پھر بولا..... ''اس صورت میں ایک ہی بات ہوگی..... میں واپس آجاؤں گا اور یہیں رہوں گا..... آپ کے پاس.....''

''اور تمہاری بیوی اور بے بی.....''

کچھ دیر لمبے لمبے سانس بھرتا جہانگیر چائے پیتا رہا۔ پھر کسمسا کر بولا..... ''وہ تو شاید نہ آسکیں۔ دیکھیں آگے آگے ہارون کی تعلیم کا اصلی مسئلہ ہوگا..... ہمارے وطن کی تعلیم سے تو اب کیریئر نہیں بنتا ناں..... شاہدہ میں ایک خوبی ہے ابا جی۔ وہ وقت کی ضرورت کے تحت بہت جلد تبدیل ہو جاتی ہے..... اسے کچھ چھوڑ کر راستہ بدل کر، غلط یا درست فیصلہ کر کے دیر تک احساس جرم نہیں ہوتا۔ وہ Move Over میں یقین رکھتی ہے..... میں بند گٹر کی طرح ہوں۔ ایک بار Choke ہونے لگے تو پھر ہوتا ہی چلا جاتا ہے.....''

اس کے بعد ہم میں کوئی بات نہ ہوئی اور ایک ان کہا سمجھوتہ ہو گیا کہ میں کوٹھی بیچ کر امریکہ سدھاروں گا..... جہانگیر کا زیادہ وقت علاقے کے پراپرٹی ڈیلروں کے ساتھ گزرتا، لیکن ملکی حالات، ڈالر کی چڑھتی قیمت اور بھارت کے جارحانہ سیاسی رویے کی بدولت قیمتیں گر رہی تھیں۔ دو ایک بار اخباروں میں اشتہار بھی دیئے، لیکن گاہک ان مانے جی سے کوٹھی دیکھ کر یوں لوٹے، جیسے سانولی چھوٹے قد کی غریب لڑکی کا رشتہ دیکھ کر لڑکے والے واپس چلے جایا کرتے ہیں۔ پھر جہانگیر نے کوٹھی کے گیٹ پر فار سیل کا بڑا سا بینر لگا دیا۔ ہم دونوں مل کر گھر کا سامان پیک کرنے لگے۔ پیکنگ کے دوران بھی کچھ وقت باہمی مشورہ کے تحت بسر ہونے لگا۔

''ابا جی آپ کوٹھی کو فرنشڈ حالت میں بیچیں۔ آپ کو اس طرح کسی کباڑیئے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی اور آپ سامان کی کھینچل سے بھی بچ جائیں گے۔ سامان الگ فروخت نہیں کرنا۔ یہ بہت Hassle ہے''۔

''ایسے ہوسکتا ہے کہ میں ضرورت کا کچھ سامان گیراج میں رکھ جاؤں.....''

''جب کوٹھی بک گئی ابا جی، تو پھر گیراج میں سامان کون رکھنے دے گا؟ ویسے بھی صوفے، قالین، میزیں، الماریاں پرانی وضع کی ہیں۔ ان کا کیا ملے گا بھلا''۔

میں نے کہنا چاہا کہ سامان کے ساتھ استعمال کی وجہ سے یادوں کی ایک برات رہا کرتی ہے۔ اس کا کیا کروں گا؟ لیکن چپ رہا۔ جس روز پی آئی اے کے دفتر سے جہانگیر ٹکٹیں بنوا کر واپس لوٹا، شام کافی جا چکی تھی۔ پچھلی لان میں بڑے چھتنارے درخت پر میری نگاہ پڑی۔ کوؤں کی ایکٹولی سنبل کے درخت پر کائیں کائیں کرتی آ کر بیٹھتی، پھر پہلے سے زیادہ شور کرتے، بلبلاتے، واویلا مچاتے سارا گروہ شام کے دھندلکے میں اڑ کر غائب ہو جاتا۔ درخت ساکت و صامت ان کی اڑان سے بے پرواہ اپنی جگہ اٹل رہتا۔ کوے نہ جانے کہاں کا روند کر کے ایک بار پھر ہلا مار کر ڈالیوں پر آ گرتے۔ شام کا اندھیرا انکی بے قرار کو درخت میں جذب کرنے کی کوشش کرتا۔ میں اس سٹپٹاہٹ کو اپنے اندر کی کھلبلی کے ساتھ میچ کر کے دیکھ رہا تھا۔

جہانگیر نے آ کر لمبی سانس لی۔ اپنے دونوں پاؤں بوٹوں سمیت سنٹرل ٹیبل پر جمائے اور صوفے کی پشت سے سر ٹکا کر بیٹھ گیا۔

''مال کا کام ہوا ہے آج تو۔ میرا ایک پرانا دوست پی آئی اے کے آفس میں مل گیا۔ وہ اس کوٹھی کو فوراً خریدنا چاہ رہا ہے..... اور قیمت بھی اچھی مل جائے گی..... کراچی سیٹشفٹ کرنا چاہ رہا ہے۔ آپ کو عارف یاد ہوگا ابا جی..... میرے ساتھ ساتویں میں پڑھا کرتا تھا..... ہم اکٹھے فٹ بال کھیلا کرتے تھے''۔

''وہ..... وہ عارف جس کے چہرے پر ماتا کے دماغ تھے.....''

''جی بالکل بالکل وہی عارف..... کراچی کے حالات ٹھیک نہیں..... اس کے ایک بھائی کو کسی نے شوٹ کر دیا۔ لوگ دل برداشتہ ہو کر کراچی چھوڑ رہے ہیں..... وہ بھی سمجھتا ہے اور میں بھی جانتا ہوں کہ ہمیشہ تجویز کام نہیں آتی۔ کبھی کبھی عجب طور پر خوش

قسمت آپ کے تعاقب میں وہتی ہے..... اب آپ ساری کشتیاں جلا دیں۔ ابا جی ..... آپ سکندر کا نصیبہ لے کر پیدا ہوئے ہیں..... آپ کا ہر کام بروقت اللہ کی طرف سے ہو جاتا ہے....."

جہانگیر زندگی کے دریا کو قابل عبور سمجھتا ہوا سیڑھیاں چڑھ گیا..... جب کافی رات جا چکی اور نیند کی گولی کھانے کے باوجود مجھے نیند نہ آئی تو میں جہانگیر کے کمرے تک گیا، ہلکی سی دستک دی۔ اندر سے کم ان پلیز کی آواز سن کر میں اندر داخل ہو گیا۔ جہانگیر پلنگ پر لیٹا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نیند تھی۔

"آیئے آیئے....." اس نیا ٹھنے کی کوشش کی۔

"لیٹے رہو..... لیٹے رہو"

میں کچھ دیر سراسیمہ سا صوفے پر بیٹھا رہا۔ پھر لمبی خاموشی کو توڑ کر بولا..... "بات یہ ہے کہ میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا بیٹا....."

"لیکن کیوں..... کیوں ابا جی....."

"تمہاری ماں زندہ ہوتی تو ضرور چلی جاتی بیٹا..... لیکن میں نہیں جا سکتا....."

جہانگیر کے چہرے پر پریشانی آ گئی۔

"لیکن....."

"بات یہ ہے کہ نروان حاصل کرنے کے لئے تمہیں اکیلے ہی نکلنا ہو گا..... میں نے جہاں تک ممکن تھا، تمہیں راحت میں پالا..... کوشش کی کہ تمہیں کوئی غم کوئی محرومی کوئی تکلیف نہ ہو لیکن....."

"میں آپ کو یہاں چھوڑ کر وہاں کیسے خوشی کی زندگی بسر کر سکتا ہوں..... میں اتنا Stress کیسے برداشت کروں گا ابا جی....."

"میں سمجھ گیا ہوں، ہر انسان کے لئے گرم سرد کٹھالیوں میں سے گزرنا ضروری ہے۔ میں تم کو صرف راحت کا سبق دینا چاہتا تھا، لیکن غم بھی تو انسان کا استاد مکرم ہے۔

ہماری روح دکھ کے بغیر بالیدہ نہیں ہوسکتی، اوپر اٹھ نہیں سکتی۔تم تو مارڈن آدمی ہو، جانتے ہو۔جب تک راکٹ کے نیچے دہکتی آگ نہیں جلتی، تب تک اس کا خلائی سفر شروع نہیں ہوتا..... گھبراؤ نہیں واپس لوٹ جاؤ..... نروان حاصل کرنے کے لئے کپل وستو چھوڑنا پڑتا ہے شاکیا منی..... ہجرت بنیادی اصول ہے آگاہی کے لئے۔ وہاں تمہیں اپنا راستہ مل جائے گا..... جب تک تم مجھ سے فارغ نہ ہوئے قد آور درخت نہیں بن سکو گے، ہمارے لئے فراق ضروری ہے"۔

"لیکن اتنی تکلیف..... اس قدر سوچ کا وزن میں کیسے برداشت کروں گا..... اور پھر آپ یہاں کیا کریں گے اکیلے؟"

"جب فطرت اکیلا کردے تو گھبرانا نہیں چاہئے جہانگیر..... یہاں ان کمروں میں تنہائی کی زندگی بسر کرتا میں بھی اپنے راستے کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوگیا ہوں۔ اب مجھے علم ہوگیا ہے کہ مرد اور عورت کا اسلام اپنے جوہر میں ایک دوسرے سے مختلف ہے۔عورت پرورش کے لئے بنی ہے اور مرد کفالت کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔پرورش کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے، لیکن جب بیٹا اپنی کفالت کے قابل ہو جاتا ہے تو باپ کی ضرورت نہیں رہتی..... پھر باپ کو بیٹے سے دست کش ہو جانا چاہئے"۔

"یہ غلط ہے جھوٹ ہے..... میں آپ سے کبھی بھی دست کش نہیں ہوسکتا"۔

"غور سے سنو بیٹا..... تم تفکر کرو تو جان جاؤ گے۔حضرت ابراہیم علیہ السلام جد الانبیاء کا مسلک اور ہے اور بی بی ہاجرہ کسی اور راستے کی مسافر ہیں..... حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بت نکال کر پھینک دے۔اسے سیدھے راستے پر چلنے والے پیغمبر بیٹے، گھوڑے مویشی باغ..... کھیتیاں عورتیں سب راستے کا روڑا ہیں۔ نبی کے لئے ان کی رغبت ٹھیک نہیں۔جب مکان خالی ہوا تو مکین خود بخود آجائے گا..... حضرت ابراہیم علیہ السلام بیٹے کی قربانی پر رضامند ہوگئے، لیکن عورت کے لئے اور حکم آیا تھا۔ بی بی ہاجرہ پرورش کی ضامن تھیں۔وہ صفا و مروا کی پہاڑیوں پر دوڑتی رہیں۔التجائیں

کرتی رہیں، روتی گڑگڑاتی رہیں حتیٰ کہ دودھ کے ابال کی طرح چشمہ نکلا تو بی بی ہاجرہ نے خوفزدہ ہوکر کہا..... زم زم..... رک رک..... پرورش کی ذمہ داری میں سرگرداں وہ بھاگتی رہیں اور آج کوئی عورت صفا و مروا کے مقام پر نہیں بھاگتی۔ بی بی ہاجرہ نے سب عورتوں کے حصے کی سعی کرلی۔ ان کی دعاؤں کے طفیل کل عالم اسلام آب زم زم کی زمزمیاں بھر بھر لاتے ہیں..... خود بھی اس پانی سے پاک ہوتے ہیں اور دوسروں کا میل بھی کاٹتے ہیں۔ عورت مرتے دم تک بچے کے لئے سرگرداں رہے عین سعادت! باپ بیٹے میں ضم ہو جائے حکم عدولی۔"

"آپ کی بات میں نہیں سنتا ابا جی..... میں ایک لمحہ ایک دن آپ کے پیغمبر نہیں کاٹوں گا....."

"تمہیں وہاں کوئی تکلیف ہے....."

"جی نہیں....." جہانگیر بولا۔

میں نے اپنی داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا..... "بھائی میرے پھر بات تو سن لو..... آنول تو ماں بھی کاٹ دیتی ہے..... میں تو پھر صرف باپ ہوں"۔

"آپ جو مرضی کہیں..... آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا، پڑے گا چلنا..... میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا..... نہیں جاؤں گا۔"

"بھلے آدمی جد الانبیاء کا حکم ہے، بیٹے کے گرد طواف کرنے کے بجائے خانہ کعبہ کے چکر پھیرے کرو۔ اب ان کے آگے تیری بات کیا حیثیت رکھتی ہے....."

جہانگیر یکدم چپ ہوگیا

"اچھا جی....."

میں نے دل برداشتہ جہانگیر کے ہاتھ پر ابھرویں رگوں بھرا اپنا ہاتھ رکھا اور آہستہ سے بولا..... "زندگی میں سیکھنے کے دو ہی طریقے ہیں، بیٹا۔ یا تو بڑوں کی بات مان لو اور شاہراہ کو اختیار کرلو یا پھر اپنے تجربوں کی پگڈنڈیوں پر چلتے پھرتے بند راستوں

میں سے لوٹتے ہوئے نروان حاصل کرو..... دیکھ لو پاٹلی پتر کا شاکیا منی باپ کی عطا کردہ راحتوں میں نہ رہ سکا..... تم کو ہجرت کا راستہ اپنانا پڑا..... بھیا اب ہم دونوں الگ الگ ہیں۔ آنول کٹ چکی ہے..... مجھے میرے حال پر چھوڑ دو اور دیکھو کبھی پلٹ کر نہیں دیکھنا، ورنہ پتھر کے بن جاؤ گے"۔

مجھے چھوڑ کر جہانگیر چلا گیا۔ پھر جہانگیر کی اطلاع کم کم ملتی رہی۔ میرا بن باس اور جہانگیر کا نروان شروع ہو گیا۔ ہم دونوں آگہی کی مختلف منزلوں میں بھٹک رہے تھے۔

خبر آئی اس کے دن مصروف رہتے ہیں۔ جمعے کی نماز وہ اسلامک سنٹر میں پڑھتا ہے۔ دن پر دن اسلام کی طرف راغب ہوتا جا رہا تھا۔ یہ بھی سنا کہ شاہدہ کو اسی بات کا خوف تھا کہ کہیں ایک دن بیٹھے بٹھائے جہانگیر حجاب پہنانے پر اصرار نہ کر بیٹھے۔ امریکہ جیسے ملک میں اسے ہر قسم کی آزادی تھی، روپے پیسے کی کمی نہ تھی..... لیکن یہ فکر اسے اندر ہی اندر پریشان رکھتی..... شاہدہ کو اسلام کی ساری باتیں پسند تھیں، لیکن وہ تعداد ازدواج ارحجاب سے اس درجہ خوفزدہ تھی کہ اسے جہانگیر بھی بنیاد پرست نظر آتا، شاہدہ کا بھی کوئی قصور نہ تھا۔ وہ جب سسرال میں تھی تو یہاں ہم دونوں تھے جن سے جہانگیر محبت کرتا تھا۔ اپنے کارخانے دار باپ کے گھر چلی گئی تو وہاں جہانگیر کی غیرت تھی جو اسے پر پیچ کیے رکھتی تھی۔ اب امریکہ میں اسے بنیاد پرستی سے خوف آنے لگا تھا۔ نہ جانے یہ خوف اس کے اندر کب سے اور کیوں تھا۔ ہر جنت کو یہی خوف کا کیڑا کھا جاتا ہے۔ شاہدہ تبدیلی کی خواہش مند ہوتے ہوئے بھی اس سے سمجھوتہ نہ کر سکتی۔ تعداد ازدواج اور حجاب کا اسے ذاتی طور پر کوئی تجربہ نہ تھا، لیکن وہ اس سے ایسے خوفزدہ تھی جیسے ایڈز کی بیماری ہو اور اسے یہ بیماری لگنا ہی لگنا ہو۔ اس کی ساری آزادی کو اس خوف نے غلامی میں بدل دیا تھا۔

بیلکونی میں بیٹھا میں سوچتا ہوں کہ امریکہ کا سب سے بڑا تضاد بیک وقت محبت کی طلب اور آزادی کی خواہش ہے..... اور اب ٹھونک بجا کر امریکی فرد نے یہ فیصلہ

کرلیا ہے کہ محبت کا بندھن کبھی کبھی اور آزادی کی آب وہوا ہمیشہ رہنی چاہئے۔ آزادی کی یہ خواہش امریکہ کے معاشرے میں ایک بے اطمینانی پیدا کر رہی ہے۔ انسان چونکہ تضاد سے بنا ہے، آگ اور پانی سے سناجوگ کی وجہ سے تضاد اور دوئی کی خو بو اس میں ہمیشہ رہتی ہے۔ وہ آگ کی طرح بھڑکتا، لپکتا اور گرم کرتا ہے اور ساتھ ساتھ مشل پانی بجھاتا، بجھتا، بہتا اور سرد بھی کرتا ہے۔ اس کی خوبی اس کی خرابی میں بدل جاتی ہے اور اس کی خرابی ہی اسے خوبی کا راستہ سمجھاتی ہے۔ اسی لئے یہاں ایک لمحہ فکریہ یہ بھی سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ کسی انسان پر تنقید کہاں تک جائز ہے۔ جس چور کو ہم سزا دلانے لے جا رہے ہوں، شاید وہی قطب بن کر ہماری اور اپنی عاقبت سنوار دے۔ گو خرابی سے خوبی کا سفر یقینی نہیں، لیکن امکانات ضرور ہیں۔ اسی امکان میں اس کی خود مختاری پنہاں ہے..... اسی امکان میں اس کے سارے امکانات پوشیدہ ہیں۔ زندگی کے سفر میں ساری رنگینی، تڑپ اور اسرار اسی بنیادی دوئی میں اس کے اندیشوں میں چھپے ہیں۔ خوبی اور خرابی، جنگ و امن، حق و باطل خوشی و غم توام ہیں، زوج ہیں، خوبی کب خرابی میں بدل جاتی ہے۔ نیکی کو کب اور کیسے بدی کا چولا پہن لینا پڑتا ہے۔ غم کن حالات میں خوشی کو راہ دیتا ہے اور حق کی جنگ کب باطل میں بدلتی ہے۔ زندگی کا سارا سفر اسی ادل بدل کے سہارے گزرتا ہے۔

بیلکونی میں بیٹھ کر سوچتا ہوں۔ اقلیتوں کے مسئلے ترقی کی دوڑ اور اس سے وابستہ مسائل نے محبت کے عیسائی فلسفے پر سب سے کاری ضرب لگائی ہے۔ Free Will کی آزادی طاقت ور لوگوں کا مسلک ہے۔ مرضی اور اختیاری ارادہ انسان کو جہاں ترقی کا سبق پڑھاتا ہے۔ وہیں محبت سے آزادی حاصل کر کے انسان پر اعتماد ہو کر نفرت کرنے کو بھی اپنے بنیادی حقوق میں شامل کر لیتا ہے۔ جب تک حرت مسیح کا ٹکٹ سکہ چلتا تھا، کسی سے نفرت کرنے کے بعد لوگ احساس جرم میں مبتلا رہتے تھے۔ پادریوں کے آگے دستہ بستہ Confessions کر کے اپنے آپ کو پاک

کرتے رہتے تھے، لیکن اب محبت کی صلیب سے اتر کر اپنی مرضی کو کسی کی خاطر قربان کرنا آج کے سفید فام معاشرے کا شیوہ نہیں۔ ایسے عمل سے آزادی تلف ہوتی ہے اور محبت اور آزادی میں بنیادی تضاد ہونے کی وجہ سے امریکہ کے معاشرے نے آزادی کے حق میں ووٹ دے دیا ہے اور محبت سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔

آزادی اکیلے آدمی کا سفر ہے۔ رسی تڑوا کر سرپٹ بھاگنے کا عمل ہے۔ محبت ہاتھ باندھ کر اپنی خوشی اور اپنی آزادی کے پھول ارپن کر کے سر نے ہووڑائے اشکبار آنکھوں سے Free Will کو ارادی طور پر ساقط کرنے کا نام ہے۔ محبت اس غلامی کا طوق ہے جو انسان خود اپنے اختیار سے گلے میں ڈالتا ہے۔ یہ عہد پیری مریدی کا نہیں کہ مرشد منوانے اور سالک ماننے کے مقام پر ہو۔ یہ زمانہ شادی کا بھی نہیں کہ شادی میں بھی قدم قدم پر اپنی مرضی کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جس طرح اپنے بیٹے کو قربان کرنے پر راضی برضا رہے، یہ محبت کی ایک عظیم مثال ہے۔ محبت میں ذاتی آزادی کو طلب کرنا شرک ہے، کیونکہ بیک وقت دو افراد سے محبت نہیں کی جا سکتی، محبوب سے بھی اور اپنی ذات سے بھی۔ محبت غلامی کا عمل ہے اور آزاد لوگ غلام نہیں رہ سکتے۔

میں نے بہد یکھا ہے کہ زیادہ محبت کرنیوالے عموماً اظہار محبت میں کوڑھ مغز ہوتے ہیں۔ وہ پھول اور چوکلیٹ لے کر محبوب کے دروازے پر حاضری دینا بھول جاتے ہیں۔ عام طور پر وہ دربان سے لیکر محبوب تک اپنی ذات کا گلدستہ ہی پیش کرتے رہتے ہیں۔ سٹ پٹا جانا، چپ لگنا، ہاتھ پاؤں پھول جانا، بغیر جواز پیش کئے چپ چاپ لوٹ جانا، محبت کرنے والوں کا وطیرہ ہوا کرتا ہے۔ آزادی پسند لوگ پوجا کرنے، آرتی اتارنے، مالا جپنے سے نا آشنا ہوتے ہیں۔ آپ نے امریکہ کی پارکوں، بازاروں، ایئرپورٹوں، بسوں، ہوٹلوں میں ایسے جوڑے دیکھے ہوں گے، جن کے ہاتھ ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہو پاتے، جن کے بدن بیلوں کی طرح ایک

دوسرے سے لپٹے جاتے ہیں۔اس محبت میں ایسے درجے کا اعلان ہے جس کی توفیق آزاد عاشق کو کم کم ملتی ہے۔ یہ محبت کسی آئینے میں اپنی صورت دیکھتے رہنے کی ہوس ہے۔عاشق محبوب کے آئینے میں اپنی ہی ذات پر مفتون رہتا ہے۔امریکہ میں جہاں ہر شے چمکائی ستھرائی سجائی اور آئیڈیل بنائی جاتی ہے جہاں اپنے Product کو بہتر بنانے کا جنون ہے۔ یہاں محبت ایسے Perfectionist ہاتھوں سے بڑے عذاب جھیلتی ہے۔ یہاں آزادی پسند عاشق پہلے محبوبہ تلاش کرتا ہے۔پھر اسے کبھی خوردبین لگا کر کبھی دوربین کی مدد سے بغور دیکھتا ہے۔محبت کی اولین سرشاری میں ہی محبوب کی سرجری شروع ہو جاتی ہے۔اس کی عادتیں، کردار، عقل شکل، ماضی کی مناسبتیں، مشغلے سب کی دھجیاں اڑائی جاتی ہیں۔نفرت کرنے پر قادر آزاد انسان نکتہ چین بن جاتا ہے۔اب عاشق اور محبوب دونوں سچ کی بے نیام تلوار لے کر باہر نکلتے ہیں اور جونہی عاشق کی آنکھوں سے عقیدت و احترام کی عینک اترتی ہے، اسے محبوب کچھ ایسی تیس مار خاں نظر نہیں آتی۔ یہاں سے محبت کا سفر خاردار جھاڑیوں کے درمیان سے گزرتا ہے۔آزادی کے طالب علم کے لئے زیادہ دیر زنجیر پا رہنا ممکن نہیں رہتا پھر اپنی بغل سے اپنا ہی بت نکال کر وہ از سر نو اس کی پوجا شروع کر دیتا ہے اور اسی لئے غیر کی محبت کا رہین نہیں رہتا۔مغربی معاشرے کا یہی المیہ ہے..... کہ یہاں محبوب کا ''ناٹھیک'' ٹھیک نہیں ہوا کرتا۔تھوڑی دیر کے لئے تو آزاد عاشق چاکری پر رضامند رہ سکتا ہے۔لیکن مستقل طور پر عموماً امریکی فرد کا یہ شعار نہیں۔

محبت نہ تو اپنی ذات کی نمائش ہے، نہ من و تو کی تفریق ہے۔امریکہ کے آزاد معاشرے کے لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر آپ کو اپنی ملازمت پسند نہیں تو فوراً بدل لیں۔ موسم راس نہیں آتا تو کسی ایسی ریاست میں بسیرا کریں جہاں موسم آپ کی طبیعت کے مطابق ہو، اگر بیوی ناپسند ہے تو معاشرے کے دباؤ بچوں کی خاطر اسے لٹکائے نہ پھریں۔جب بھی کوئی موسم حالت، جگہ انسان آپ کی شخصیت سے ٹکرائے، اسے فوراً

راستے سے الگ کر دیں اور محبت کا جواء اتار کر آزادی کا کنکوا اڑائیں۔

مغربی معاشرے نے غالباً انسان کے اس بنیادی تضاد کو بھلا دیا ہے کہ وہ مجبور بھی ہے اور بااختیار بھی۔ محبت اور آزادی کے تضاد میں عموماً آزادی ہی جیت جایا کرتی ہے..... جہاں تک ایکپاؤں اٹھانے کا تعلق ہے ہم بااختیار ہیں، لیکن دوسرا پاؤں اٹھانے پر قادر نہیں۔ آزادی ہمیشہ پابندی سے مشروط رہے گی، اگر انسان تمام پابندیاں توڑ کر ساری اقدار سے مادر پدر آزادی حاصل کر کے زندہ رہنا چاہے تو اسے یا تو کسی پہاڑ کی چوٹی پر رہنا پڑے گا یا جیل کی کوٹھڑی میں۔ میں بھی آزادی کی تلاش میں ارجمند کے گھر آیا تھا۔ یہاں پر ایسی محبت حاصل ہوگی جس کا کئی برسوں سے میں عادی نہ رہا تھا۔ یہاں مجھے نہ آزادی کا احساس ہوا نہ محبت کا۔ ڈاکٹر بلال کا اپنا دائرہ کار ہے، ارجمند اپنی مصروفیت میں گم رہتی ہے۔ قیصر اور جمشید کے ساتھ پتہ نہیں کیوں میری اچھی Equation نہ بن سکی۔ وہ دونوں بھی اپنی روٹین کے تابع ہیں۔ چھوٹے چھوٹے میرے ساتھ وقت گزارنے کے بجائے ابھی سے کمپیوٹر کے اردگرد رہتے ہیں۔ کارٹون دیکھتے رہنا ان کی ہابی ہے۔ وہ برگر، چپس، کوکا کولا، جوس، چوکلیٹ کے رسیا ہیں۔ جب جی چاہتا ہے فریج کھول کر کچھ نہ کچھ نکالتے اور کھانے لگتے ہیں۔ وہ اپنے معاملات میں ابھی سے آزاد ہیں، انہیں نہ کسی سے اجازت لینے کی ضرورت ہے، نہ انفورم کرنے کی۔ اس طرح ارجمند پر ان کی پرورش کا بوجھ کم ہوتا ہے۔ لاتعلقی بڑھتی تھی تو یہ بھی اس کی ضرورت تھی، کیونکہ ایسے میں اسے آزادی بھی زیادہ ملتی، لیکن محبت کئے بغیر کسی دوسرے انسان کو نہ کوئی جان سکتا ہے، نہ جان دے سکتا ہے۔ ریستورانوں، کلبوں میں، تفریحی پروگراموں میں ہمدردی پیدا ہو سکتی ہے۔ Infatuation کا روگ لگ سکتا ہے، محبت ممکن نہیں۔ سب سے زیادہ ماں بچے پر وقت ضائع کرتی ہے، لیکن یہ وقت ضائع ہو کر ایک ایسی نعمت میں بدل جاتا ہے جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔ مغربی لوگوں نے کام کے حق میں ووٹ دے کر مشرقی

لوگوں کی اس فلاح کو کھو دیا ہے، جہاں وقت کو ضائع کر کے ہی محبت ملا کرتی ہے۔ Support System بامعنی ہوتا ہے۔ رشتہ داریاں چلتی ہیں۔ پیری مریدی کا سلسلہ قائم ہوتا ہے اور ضائع وقت سونے میں بدل جاتا ہے۔

اس اینٹی محبت کا معاشرہ قائم کرنے میں اقلیت نے بنیادی کام کیا ہے۔ سفید فام واضح طور پر اینٹی محبت پر عمل کرتے ہیں۔ چونکہ مغربی لوگ محبت کو جزو ایمان نہیں سمجھتے، اس لئے انہوں نے احساس جرم تلے خیراتی ادارے کھولے ہیں۔ ویل فیئر سٹیٹ بنا کر بے روزگار، پس ماندہ لوگوں کی مدد کی ہے۔ بوڑھے لوگوں کے ادارے بنائے ہیں۔ جہاں بڈھے موت کے انتظار میں درست دوائیاں، طاقت افزا وٹامن، خوراک، آرام حتیٰ کہ تفریح بھی باقاعدگی سے کرتے ہیں، لیکن ان بڈھوں سے محبت کوسوں دور رہتی ہے۔ وہ Volunteers اور وقت بے وقت آنے والے مہمانوں کو انتظار میں خالی دن خالی راتیں بسر کرتے ہیں۔ Baby Care Day Care سنٹر کے پاس بچہ چھوڑا بھی جا سکتا ہے اور پل بھی جاتا ہے، لیکن نہ اسے ماں کا دودھ ملتا ہے، نہ ماں کی محبت کا شہد آگیں رس اس کی رگوں میں دوڑتا ہے۔ اپنے اپنے کاموں کے بعد ساتھی پر کام کی تھکن، اضطراب اور ڈیپریشن نکالنے کا نام شخصی آزادی ہے۔ کام کے بعد دونوں ساتھی خیں خیں کر کے ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ کوئی بھی تازہ دم کرنے والی محبت پر وقت اور توجہ صرف کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ گھر پر بھی کاموں کی زیادتی منہ کھولے دونوں کو ہڑپ کرنے پر آمادہ نظر آتی ہے، ہو سکتا ہے کہ اس اینٹی محبت کا الزام ہم صنعتی انقلاب پر دھریں اور ترقی کی خاطر ان قربانیوں کو درست جانیں جو آج کا ماڈرن تعلیم یافتہ آدمی دے رہا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ جب محبت حاصل نہیں ہوتی تو آدمی کھاتا ہے، لیکن سیر نہیں ہوتا۔ مکان قسطوں پر حاصل کر لیتا ہے، لیکن وقت کی کمی کے باعث مکینوں سے بچھڑ جاتا ہے۔ محبت کی تلاش چھوڑ کر جنس کا لٹیرا ڈانس میں تھرکتا ہے، لیکن روح پیاسی رہتی ہے، بازاروں کے

طواف کر کے زیبائش، آرائش، نمائش کی اشیاء خریدتا رہتا ہے، لیکن ان اشیاء کی قسطیں گننے کے بعد انہیں انجوائے نہیں کر سکتا، کیونکہ وقت اور محبت کی قلت اسے نہ تو کسی چیز سے، نہ ہی کسی انسان سے رابطہ قائم کرنے دیتی ہے اور نہ ہی اس کمی کے متعلق سوچنے کی مہلت فراہم کرتی ہے۔

اینٹی محبت معاشرہ قائم کرنے میں اقلیتوں سے نفرت نمبر ۱ اہم کام کیا ہے۔ کالے، براؤن، چپٹی ناک والوں سے چونکہ محبت نہیں کی جا سکتی اس لئے ان کو آزادی دے کر اور خود ان سے گلو خلاصی کرنے کے لئے آزادی حاصل کرنا ضروری ہے۔ مشرق معاشرے میں ابھی لوگ محبت کے پیاسے ہیں اور پریم جل کے بغیر ان کی پیاس نہیں بجھتی۔ رشتے ناطے ابھی جذبوں میں گندھے ہیں یا وقت کو سونا بناتے ہیں۔ ہم بچھڑے لوگوں کی یادوں کو مختلف موسموں میں ازسرنو تلاش کرنے میں وقت ضائع کرتے ہیں۔ نغمہ، چاندنی اور چہرہ ابھی بے ربط نہیں ہوئے۔ مغرب اور مشرق اسی لئے کبھی مل نہیں سکے کہ ہماری سوچ مختلف ہے۔ امریکہ خاص طور پر اور سفید فام مغربی معاشرہ عام طور پر محبت سے بچھڑ چکا ہے۔ سفید فام لوگوں نے جان لیا ہے کہ محبت کا سفر دراصل صحرائی لوگوں کو راس آ سکتا ہے اسی لئے انہوں نے فرد کے لئے آزادی کا دریچہ کھول کر اسے پہنائیوں میں تنہا اڑنے کی دعوت دی ہے، بلکہ اسے تنہائی پر اکسایا اور ترغیب دلائی ہے..... ایسے معاشرے میں انسان راضی برضا نہیں رہ سکتا، نہ مزاج یار کے تابع رہ کر زندگی بسر کر سکتا ہے۔ مشرق کے سفر میں نفس کو ساقط کر کے نروان تک پہنچا جا سکتا ہے۔ مغرب میں شخص کے ماتھے پر تلک لگا کر گلے میں ہار منہ میں گلوری دبا کر حواس خمسہ کی گاڑی میں بیٹھ کر لذت کا سفر کیا جاتا ہے۔ محبت کا سفر محبت کی خاطر ہو یا اللہ کے لئے اختیار کیا جائے تو اس میں آنسو، صبر اور ایثار ہی ایثار کا موسم رہتا ہے۔ یہاں شاید خوشی نہیں ملتی، لیکن شانتی اور قناعت ضرور ہمرکاب رہتی ہے۔ حدود سے نکلنے کی آرزو نہیں رہتی۔ محبت کی سرشاری میں انسان حاکم نہیں محکوم

بنتا ہے۔ دوسروں پر ضرب کاری لگانا اور ان سے آگے نکل جانا ممنوع ٹھہرتا ہے۔ آزادی کی ابابیل دوسروں سے آگے اڑنے کو اپنا طرہ امتیاز بناتی ہے۔ مسابقت کی فضاء اسے راس آتی ہے، آزادی کا منطقی تقاضا ہے کہ وہ کسی ایمان، چاہت یا فعل کی نفی کرتے ہوئے احساس جرم میں مبتلا نہ ہو۔ جہاں محبت ذات کی نفی میں لگی رہتی ہے، وہاں آزادی کا مرکزی Spindle ہی شخصا یا Self ہے۔ اسی کے گرد زندگی کے سارے محرکات چکر لگاتے ہیں۔

جس گزبو کا میں بار بار آپ سے ذکر کرتا ہوں، وہ دراصل لکڑی کا بنا ہوا ایک کنڈ ہے جس کا اندر لکڑی کی بنچیں ہیں۔ ایک جانب سے رستہ کھلا ہے اور اس کی چھت چوبی ستونوں کے سہارے کھڑی ہے۔ اس کنڈ کی کوئی دیوار نہیں۔ یہ لکڑی کے ڈنڈوں کے سہارے کھڑا ہے اسی لئے ہر موسم میں یہ ہوادار رہتا ہے۔ ہوائیں، بارشیں، منظر آسانی سے نظر آتے ہیں۔ اس گزبو کے نشیب میں امریکہ کا ایک گنجان جنگل ہے جس میں اونچے اونچے درخت ہری بھری جھاڑیاں، درختوں سے لپٹی بیلیں، سرسبز گھاس، پرندے، بے ضرر جانور آزاد پھرتے ہیں۔ آسمان کی جانب منہ کر کے دیکھیں تو کبھی کبھی سو پرسونک جہاز دھوئیں کی لمبی دم چھوڑتے بھی نظر آئیں گے، تھوڑی دیر کے لئے ذہن سائنسی ترقی پر حیران ہوتا رہتا ہے۔ اس کی برکات گننے میں مشغول رہتا ہے، لیکن پھر قدرتی مناظر اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔

پکی سڑک سے اتر کر میں اس ٹاور نما جھونپڑے میں داخل ہوتا ہوں۔ بنچیں بالکل صاف ہیں۔ دھول نما کوئی چیز نہیں۔ یہاں نیلگوں آسمان پر، پتوں کی چکنی جلد پر، سڑکوں پر مٹی نہیں ہوتی۔ مجھے لاہور کی آندھیاں یاد آجاتی ہیں جو مئی کے مہینے میں ہر جگہ سے مٹی اٹھا کر لاتی ہیں۔ صبح اٹھیں تو فرشوں پر چیزوں پر مٹی کی ہلکی سی تہہ پڑی نظر آتی ہے۔ اس شفاف ماحول میں نہ جانے کیوں جی چاہتا ہے کہ کہیں سے مٹی کا بگولا اڑتا آئے اور گزبو کی بنچوں پر ستانے کے لئے رک جائے۔ میں بگولے سے

پوچھوں..... ''یہاں کہاں بھائی، وطن سے کیوں بچھڑے؟''

وہ جواب دے ''امریکہ میں کڑکنے والی بجلی اور گرجنے والے طوفان سے ملنے آیا ہوں۔ سنا ہے جب یہاں سردیوں میں بجلی پورے گھن گرج سے چمکتی ہے تو چڑیا گھر کے شیر بھی بدک جاتے ہیں۔''

میں کہوں ''پر تیرا یہاں کیا کام..... گھر چل وہاں جھاڑو بہارو پھیرنے والیاں تجھے یاد کرتی ہیں۔''

وہ بزبو میں منہ چھپا کر کہے..... ''اے بڈھے تجھ سے کس نے کہا یہاں مجھے یاد کرنیوالے نہیں ہیں۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ یہاں بھی ایسے لوگ بستے ہیں جو اپنے شہر کی گلیاں، گلیوں میں بیٹھی مٹی، تانگوں کے ٹب اڑا دینے والی آندھیوں کو یاد کرتے ہیں''۔

ابھی آندھی کا بگولہ یہاں سے رخصت ہو کر تین منزلہ کونڈوز کے پیچھے چھپا ہی تھا کہ لمبی روبینہ آ گئی۔ اس عورت سے کبھی کبھی میری ملاقات اسی گزبو میں ہو جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ایک واکر میں تین سالہ بچی ہے۔ یہ بچی شکل وصورت میں لبنان سے امپورٹ کی ہوئی لگتی ہے، جبکہ روبینہ کا حسن سندھی لڑکیوں جیسا ہے۔ ستواں ناک، تراشیدہ ہونٹ، کتابی چہرہ..... روبینہ مجھے سلام کرنے کے بعد بچی کو واکر سے آزاد کر دیتی ہے..... میں بچی کا نام بھول چکا ہوں۔ مجھے تو روبینہ کا نام بھی یاد نہیں۔ شاید اصل نام کچھ اور ہی ہو، لیکن وہ مجھے سلام کرنے کے بعد بنچ پر میرے سامنے بیٹھ جاتی ہے۔

''کیا حال ہے ثمینہ.....'' میں کہتا ہوں

''ٹھیک ہے..... میرا نام روبینہ ہے جی''۔

''ہاں بھئی اب نام یاد نہیں رہتے'' میں شرمندہ سا ہو کر کہتا ہوں۔ کیا بتاؤں یادیں مجھ سے کیسی آنکھ مچولی کھیلتی ہیں؟

''کوئی بات نہیں جی..... میں ڈاکٹر حسن کی بیوی ہوں۔''

مجھ پر حسن نامی ڈاکٹر کی کوئی حالیہ یاد نہیں ابھرتی..... حال مجھ سے بچھڑ چکا۔ میرے بڈھے نیوران حالیہ یادوں کو محفوظ نہیں کر سکتے۔ میں پچھلی یادوں کی مچھلیاں پکڑنے میں دن گزارتا ہوں اور مستقبل میں میرے لئے صرف فنا ہے جس کے لئے میں تیار نہیں ہو پاتا۔

''ہم جی..... میں نے پچھلی بار آپ کو بتایا تھا کہ ہم لوگ دس سال سے یہاں ہیں''۔

مجھ پر کوئی پچھلی بار منکشف نہیں ہوتی، لیکن میں ہاں ہوں کرتا ہوں۔

''بات یہ ہے چاچا جی..... کہ دس سال سے یہاں رہنے کے بعد بھی یہاں کی سوسائٹی میں دل نہیں لگا۔ حسن تو چاہتے ہیں کہ واپس چلے جائیں، لیکن بچے رضامند نہیں ہوتے''۔

میں گھنگھریالے بالوں والی گوری چٹی بچی کو گراس ہوپر پکڑتے دیکھتا ہوں۔ مجھ پر اس کے دوسرے بچوں کی عمر، شکل قد کوئی بھی چیز واضح نہیں۔

''جب ہم یہاں آئے تھے تو ہمارا خیال تھا کہ یہ جلاوطنی چند سال کی ہے، لیکن پھر یہاں کی زندگی دلدل بن گئی۔ روزی کمانے آئے تھے۔ اب یہاں کے ہی ہو رہے ہیں۔ کچھ سمجھ نہیں آتا..... کیا کریں چاچا جی۔ وطن بھولتا نہیں اور تن آسانی واپس نہیں جانے دیتی''۔

''سمجھ کے کیا لینا ہے بی بی..... ہجرت بھی ایک سنت ہے۔ آپ اس پر عمل کر رہی ہی خیر ہے!''

''اب تو یہی بات حسن بھی کہتے ہیں..... لیکن جی ہم تو دین کی خاطر نہیں آئے پھر یہ..... ویسی ہجرت تو نہ ہوئی ناں نبی ﷺ والی.....''

''ایسی ویسی نہ سوچو..... ہجرت بھی اپنے اپنے ظرف کے مطابق کی جاتی ہے تم روزی کی خاطر آئی بیٹھی ہو یہی بہت کافی ہے..... یہاں رہو اچھا کھاؤ، اچھا پہنو، اچھا

معیار زندگی اپناؤ، بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلاؤ باقی سب بھول جاؤ..... بس یہ سمجھو اصلی ہجرت نہ سہی اس کا سایہ پکڑ لیا۔"

تعلیم سے مجھے یاد آیا کہ یہاں کی رپورٹوں کے مطابق امریکہ میں ہر دس سیکنڈ کے بعد ایک بچہ سکول چھوڑ دیتا ہے۔ چھٹی جماعت میں پڑھنے والے بیس فیصد بچوں کو یہ بھی علم نہیں کہ دنیا کے نقشے پر امریکہ کہاں ہے۔ ہر سال قریباً سات لاکھ طالب علم پڑھے لکھے جاہل بن کر گریجوایٹ کہلاتے ہیں۔

امریکہ میں پبلک سکول کی تعلیم روز افزوں تنزلی کی طرف مائل ہے۔ اس کا کچھ کیا جانا چاہئے، لیکن میں روبینہ کے ساتھ گفتگو کو دو ہزاریہ کی اس رپورٹ کے مطابق بتانا نہیں چاہتا۔ شاید میری باتیں سن کر وہ اور بھی الجھ جائے۔

"حسن کا زیادہ وقت تو مسجد میں گزرتا ہے۔ وہ اسلامکم سنٹر کے پرجوش رکن ہیں" روبینہ کہتی ہے۔

"آپ امریکن سوسائٹی میں مدغم نہیں ہو پائے؟" میں پوچھتا ہوں۔

وہ تھوڑی دیر اپنے بائیں ہاتھ کے ناخنوں کی طرف دیکھتی رہتی ہے۔ پھر کچھ اکھڑے سے لہجے میں کہتی ہے۔

"چاچا جی عجیب سی مشکل ہے، لیکن آپ سے کیا پردہ..... جب ہم پاکستان میں تھے تو ہم دونوں کچھ ایسے پکے مسلمان نہیں تھے۔ میں نے کبھی سر پر دوپٹہ نہیں لیا تھا۔ حسن صرف عیدوں پر نماز پڑھنے مسجد جایا کرتے تھے، لیکن یہاں آکر ہم نے دیکھا کہ یہاں کا بہاؤ تیز ہے۔ اگر ہم نے اپنی شناخت قائم نہ رکھی تو ہم بہہ جائیں گے، اکثریت کے ساتھ۔ ان دم چھلا بن کر۔"

"وہ تو ہے..... اکثریت چیز ہی ایسی ہے..... اس کے فطرتی بہاؤ کے کیا کہنے؟"

"یہاں چاچا جی صرف وہ مسلمان امریکنوں سے میل جول رکھ سکتے ہیں جنہیں نہ تو یہ فکر ہو کہ ذبیحہ گوشت کوئی چیز ہوتی ہے، نہ انہیں شراب پر کوئی اعتراض ہو، نہ ہی مرد

اور عورت کے باہمی آزادانہ میل جول پر ہی برا مانیں..... اگر ان تین چیزوں کا کچھ بھی خیال ہے تو رابطے بن نہیں سکتے..... جیسے برصغیر میں ہندو مسلمان صدیوں ساتھ رہے، لیکن گھل مل نہ سکے۔"

"آخر ڈاکٹر حسن ہسپتال میں تو امریکنوں سے ملتے ہی ہوں گے۔ ان کا تو روز کا ساتھ ہے ان لوگوں کے ساتھ....."

"حسن بڑے شفیق ڈاکٹر ہیں..... میں نے آپ کو بتایا تھا ناں Pediatrician ہیں مائیں ان پر بڑا اعتماد کرتی ہیں۔ بچوں سے حسن کا ویسے بھی رویہ بہت نرم ہے، لیکن وہ میل جول کو بڑھنے نہیں دیتے..... ان کا خیال ہے کہ اگر آنا جانا بڑھ گیا تو پھر ہم امریکن طرز سوچ کو روک نہیں سکتے۔ حسن کو تو اصرار ہے کہ بچے گھر پر اردو بولیں، لیکن وہ بے وقوف آسان راستہ اختیار کرتے ہیں۔ ہم اردو میں بات کرتے ہیں، وہ انگریزی میں جواب دیتے رہتے ہیں۔ باتیں ساری سمجھ لیتے ہیں، لیکن اردو کو استعمال نہیں لاتے....."

"ہاں یہ مشکل تو ہے..... یہاں کے بچوں کی۔"

"مشکل نہیں چاچا جی..... بڑی مشکل ہے۔ آپ کو تو پتہ ہے میرا بیٹا عارف میڈیکل میں داخل ہو گیا ہے۔ بڑی بیٹی ڈنٹسٹ بن رہی ہے..... اب ان سے تو یہ امید بیکار ہے کہ وہ اردو پر توجہ دیں۔ یہ میری سارا بھی کچھ مہینوں میں مونٹی سوری میں چلی جائے گی..... پھر یہ بھی فر فر انگریزی بولے گی۔ اردو تو گئی ناں ہاتھوں سے، پنجابی تو دور کی بات ہے۔"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں ثمینہ....." میں نے غلط نام سے اسے پکارا۔

"نہیں چاچا جی آپ سب کچھ کہہ سکتے ہیں"۔ آپ ہمارے بڑے ہیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ آج کل چھوٹوں کا زمانہ ہے۔ آپ کی مان کر بھی ہم وہی کچھ کریں گے جو چھوٹے کہتے ہیں۔ اس دور میں بڑوں کی مان کر بڑے پتھریلے راستے پر چلنا

پڑتا ہے۔"

"آپ واپس نہیں جا سکتے....."

"تین سال پہلے گئے تھے جی۔ حسن نے وہاں سیٹل ہونے کی کوشش بھی کی تھی..... پر وہاں کے لوگوں نے ہمیں اپنایا نہیں۔ کچھ راستے بدل گئے..... چاچا جی ہم لوگ اس بات پر کلیئر نہیں ہیں کہ ہمیں دراصل کیا چاہئے مغرب یا مشرق..... دین یا دنیا..... ترقی یا فلاح..... جب ہم نے پاکستان بنایا تو قائداعظمؒ پر تو یہ بات واضح تھی کہ ہم الگ ملک میں کیوں رہیں گے، لیکن ہم پر ابھی تک یہ بات نہیں کھلی کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ کیا ہمیں دنیا درکار ہے کہ آخرت؟ پتہ ہے ہم اس قدر مضطرب کیوں ہیں؟ ہمارے بڑوں نے میں بتایا نہیں"۔

"میں نے بھی کبھی سوچا نہیں بیٹی....."

"جو آدمی کسی فیصلے پر پہن جاتا ہے وہ مضطوب نہیں رہتا..... جو سوچ کر بار بار اسے دوہراتا رہتا ہے، وہ الجھنوں کو دعوت دیئے جاتا ہے..... ہم ساری اقلیتیں جو امریکہ میں رہتی ہیں، بار بار فیصلوں پر نظر ثانی کرتی ہیں، اسی لئے ہمارے مسال ختم ہی نہیں ہوتے، نظر ثانی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔"

اس وقت اترائی کی جانب سے خوبصورت سا سفید خرگوش جھاڑیوں سے نکل آیا اور چپ گڑپ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ننھی سارا نے یکدم ماں کا ہاتھ پکڑ کر اسے خرگوش کی طرف گھسیٹنا شروع کر دیا۔

"یہ اقلیت بھی عجیب چیز ہوتی ہے چاچا جی..... ٹھہر جا..... ٹھہر سارا..... گھسیٹ ناں میں چلتی ہوں..... بابا چلتی ہوں....."

اپنے ہی بچے کے اصرار پر روبینہ کھچ گئی۔

"کیا عذاب ہیں یہ بچے بھی۔ اچھا کرتی ہیں یہ امریکن عورتیں بچہ ڈے کیئر میں..... خود آزاد ہم کو تو روایتیں، رسم و رواج لے ڈوبے..... شٹ۔"

وہ بچی کے اصرار پر جنگل میں اتر گئی۔اس کے اترنے کے چند لمحے بعد خرگوش کہیں غائب ہوگیا۔میں نے کچھ لمحے اس کا انتظار کیا۔پھر سڑک پر لوٹ آیا۔وہ درختوں کی اوٹ میں ہوگئی تھی۔بارش کے آثار پیدا ہو چکے تھے اور میں اپنی چھتری گھر بھول آیا تھا۔لیکن جھونپی میں سڑک تک آیا روبینہ اپنی بچی کی انگلی تھامے سامنے سے آتی دکھائی دی۔بارش سے پہلے ہوا ذرا تیز رفتاری سے چل رہی تھی، روبینہ نے ہوا میں ہاتھ لہرا کر مجھے اللہ حافظ کہا، لیکن میں رک گیا۔

''میں پہلی بار نیچے گئی تھی، چاچا جی مجھے تو بڑا خوف آیا.....'' وہ قریب آکر بولی۔

''تم مجھے کہہ دیتیں۔میں تمہارے ساتھ چلا چلتا.....''

ہم دونوں ایک بار پھر گیزبو کی طرف چلنے لگے جہاں چھوٹی سارا کی پش چیئر پڑی تھی۔

''چاچا جی پردیس میں خوف کیوں آیا ہے؟''

میں نے دماغ پر زور دے کر سوچا۔بھلا پردیس میں کیوں خوف آتا ہے؟..... کیا اپنے وطن میں خوف بھی حفاظت میں لپٹا ہوتا ہے۔

''نئی چیز، جگہ، واقعہ اس لئے خوف کا باعث ہوتے ہیں کہ انسان جس چیز کو نہیں جانتا جس سے اس کی واقفیت نہیں ہوتی، وہ خوف کا باعث بنتی ہے''۔

''کئی بار بہت واقفیت کے باوجود خوف کم نہیں ہوتا۔چاچا جی سارا بکھیڑا اقلیت ہونے کا ہے۔ہم جانتے ہیں اگر کہیں غلطی سے شبے میں ناواقف کے باعث ہم پھنس گئے تو پھر ہمانے بچنا نہیں..... حسن تو بالکل اپنے دادے کی طرح ہوتے جا رہے ہیں چاچا جی..... اب تو انہوں نے داڑھی بھی رکھ لی ہے۔میں ان سے بار بار کہتی ہوں۔بھائی اگر یہاں رہنا ہے تو لبرل ہونا پڑے گا۔ایسے داڑھی واڑھی رکھنی ہے تو گھر چلیں۔کیوں چاچا جی میں ٹھیک کہتی ہوں ناں..... داڑھی والے آدمی سے لوگ ایسے ہی بدک جاتے ہیں''۔

''بھائی ٹھیک ہی کہتی ہو۔ بنیاد پرستی اب الزام ہوگیا، پہلے یہ خوبی تھی''۔

''چاچا جی ایک بات میں سمجھ چکی ہوں..... لیکن ڈر لگتا ہے کہتے ہوئے''

''کیوں؟..... کیوں ڈر لگتا ہے''

''لوگ کہیں مجھے مار نہ ڈالیں''

''ایسی بھی کیا بات ہے؟''

''وہ چاچا جی ..... خود مسلمان اب چاہتے ہیں کہ اسلام میں کچھ ایسی تبدیلیاں آجائیں جن کی وجہ سے ہم دوسری قوموں کے ساتھ آسانی سے رہ سکیں۔ آج کا ماڈرن تعلیم یافتہ مرد اسلام مک سارے رکن مانتا ہے، لیکن جہاد کے متعلق شبہات میں گرفتار ہے۔ وہ جہاد بالنفس کو تو پھر بھی مان لے گا، لیکن دوسرا جہاد..... تلوار والا اس کے لئے وہ ایمان کہاں سے لائے؟ وہ چاہتا ہے کہ یہ سیف والا جہاد کسی طرح لبرل پانیوں سے دھل جائے۔ جب دنیا میں یو این او ہے، ہیگ میں انٹرنیشنل جھگڑے نپٹائے جاسکتے ہیں، ہر ملک میں اپنا قانون بھی ہے تو پھر جہاد کیسا اور کیوں؟''

''تم ٹھیک کہتی ہو ثمینہ''۔

اس نے اپنا نام درست نہ کرایا اور بولتی گئی۔ ایسے ہی چاچا جی عورت کے لئے حجاب بڑی زحمت بنا ہوا ہے۔ وہ اسلام کی ساری باتیں مان سکتی ہے، لیکن پردہ نہیں کر سکتی۔ کبھی وہ کہتی ہے پردہ آنکھ کا ہوتا ہے، کبھی نعرہ لگاتی ہے کہ پردہ دل میں کرنا چاہئے۔ پردے کو تو میں بھی نہیں مانتی چاچا جی..... یہاں آکر تو کوئی بے وقوف ہی حجاب لے گی ہے ناں۔''

''ہاں آج کے عہد میں جہاد اور پردہ مشکلات تو پیدا کرتا ہے ناں''۔

''چاچا جی اگر اپنے ملک میں ہوں تو پھر تو اور بات ہے۔ یہاں اقلیت بن کر ایسی باتوں کا جواب دینا مشکل ہے۔ چاچا جی ..... چاچا جی ..... اقلیت ہمیشہ کٹہرے میں کھڑی ہو کر کیوں زندگی بسر کرتی ہے۔ اس کے ہاتھ پلے کچھ نہیں ہوتا۔ وہ کب